© rasailojaraid.com

تحقیق وتنقید

قسط:۲/آخری

حافظ پروفیسر ڈاکٹر محمد دین قاسمی

غلام احمد پرویز کے ایمان بالقرآن کی حقیقت

'مفکر قرآن' جس قدر قرآن، قرآن کی رٹ لگایا کرتے، اسی قدر وہ قرآنِ کریم سے گریزاں اور کتاب اللہ سے کنارہ کش تھے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے مقابلے میں جملہ اہل علم کو قرآن سے بے خبر اور جاہل قرار دیا کرتے تھے جس کی تفصیل پہلی قسط میں گزر چکی ہے۔ مفکر قرآن کے ایمان بالقرآن کی حقیقت ذلك قولهم بأفواههم سے زیادہ نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اپنے ایمان بالقرآن کا ڈھنڈورا خوب پیٹا کرتے لیکن عملاً ان کے ہاں سند و معیار علماے مغرب کی تحقیقات تھیں۔ اس امر کے اثبات میں متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن مقالے کی تنگ دامنی کے سبب محض چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، جن میں سے دو کا تذکرہ گزشتہ قسط میں ہوچکا ہے، مزید مثالیں یہاں ملاحظہ فرمائیں:

تیسری مثال: عمر نوح علیہ السلام

قرآنِ کریم بہ نص صریح یہ بیان کرتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو سال اپنی قوم میں رہے۔ ہر دور کے علماء و مفکرین، فقہاء و مجتہدین، اہل سیر و مؤرخین، نوح علیہ السلام کی عمر نو سو پچاس (۹۵۰) سال لکھتے اور مانتے چلے آرہے ہیں، حتیٰ کہ اسی مسئلہ میں اُن معتزلہ تک نے بھی انکار نہ کیا تھا جنہیں عقلی تیر تکے لڑا کر دور کی کوڑی لاتے ہوئے نرالی اُپچ اختیار کرنے کا شوقِ فضولیات بہ مقدارِ وافر ملا تھا مگر دورِ جدید میں معدودے چند لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ وہ اس قدر طویل العمر نہیں تھے، بس زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی سو سال تک ان کی عمر تھی۔ یہ بات اُنہوں نے کسی علمی تحقیق و تفتیش کی بنا پر نہیں کہی، بلکہ صرف اس لیے کہی کہ محسوسات کے خوگر انسان کو اس قدر لمبی عمر عقلاً مستبعد دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ عقل کے یہ غلام قرآنی نصوص میں قیاسی تیر تکوں سے کام لے کر اس طویل العمری کو اس قدر قصیر العمری میں بدلنے پر جت گئے جس سے ان کی عقلی استبعاد کا ازالہ ہوجائے۔ اس سلسلہ میں آنجہانی غلام احمد پرویز کی عمر بھر کی قرآنی تحقیق و تدقیق کا ثمرہ ملاحظہ فرمائیے۔ لیکن پہلے وہ آیت ایک نظر دیکھ لیجئے جس میں عمر نوحؑ، ۹۵۰ سال مذکور ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا﴾
(العنکبوت:۱۴)

''ہم نے نوحؑ کو اسکی قوم کی طرف بھیجا تو وہ پچاس سال کم ایک ہزار سال انکے درمیان رہا۔''

اب قرآنِ کریم کی اس صراحت کے بعد 'مفکر قرآن' صاحب مفہوم آیت کو مسخ و تحریف کا نشانہ بنانے کی خاطر خواہ مخواہ یہ سوال اُٹھاتے ہیں:

''اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔''
(تفسیر مطالب الفرقان: ۵/۲۳۷)

نہ معلوم کہ یہ سوال کہاں سے اور کیونکر پیدا ہو گیا؟ جب کہ قرآنِ کریم نے بالفاظِ صریح خود ساڑھے نو سو سال کی عمر بیان کردی ہے۔ حتیٰ کہ خود پرویز صاحب کا اپنا ترجمہ آیت بھی اسی حقیقت کو واضح کر رہا ہے۔

''اور ہم نے نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان میں پچاس برس کم، ہزار سال رہا۔''
(تفسیر مطالب الفرقان: ۵/۲۳۷)

اس کے بعد اپنے موقف کے اثبات کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رکیک تاویلات پیش کی ہیں۔ جن کی تردید کی یہاں گنجائش نہیں، جو اہل علم اس پوری بحث کو دیکھنا چاہیں وہ میری کتاب 'تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ' کا مطالعہ فرمائیں۔

انکارِ طول عمر کی لِم

'مفکر قرآن' کے نزدیک خدائے قدوس کی بیان کردہ کسی حقیقت کی تردید کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ وہ اسے عقلاً مستبعد سمجھتے ہوں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''عربی لغت میں سنة کا اِطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں یعنی چار فصلوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ألف سنة کے معنی ہوں گے اڑھائی سو سال اور عامًا پورے سال کو کہتے ہیں۔ اس لیے اگر خمسین عامًا (پچاس سال) کو اس میں سے منہا کردیا جائے تو باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔''

لمبی عمر کو عقلاً مستبعد جاننا، یہ ہے وہ لِم جو اللہ کی بیان کردہ صریح اور واضح مدت کی تاویل بلکہ تحریف کی تہہ میں کارفرما ہے۔ 'مفکر قرآن' کی یہ 'تحقیق' اپنی پُشت پر کوئی علمی قوت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں رکھتی، بلکہ یہ محض ظن وتخمین اور قیاس ورائے کا نتیجہ ہے جس کی تہہ میں لمبی عمر کا استبعادِ عقلی ہی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ خود بھی خدا کی صریح اور واضح مدت کے مقابلہ میں اپنی تقصیر العمری کی تاویل پیش کرنے کی جسارت کرتے بھی ہیں تو انہیں قیاسات سے بالاتر کوئی اہمیت نہیں دیتے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

''یہ بہرحال قیاسات ہیں، تاریخی تحقیقات کسی یقینی نقطہ تک پہنچیں گی تو اس کا حتمی مفہوم سامنے آئے گا۔'' (مفہوم القرآن:ص۹۱۲)

کیا ستم ظریفی ہے کہ فرمانِ ایزدی ﴿فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا﴾ (العنکبوت:۱۴) سے تو حتمی معنی واضح نہیں ہوتا، اس لیے قیاسات اور ظن وتخمین کے گھوڑے دوڑائے جارہے ہیں اور ساتھ ہی تاریخی تحقیقات کا انتظار ہو رہا ہے کہ وہ آکر قرآن کے ان 'غیر واضح مفاہیم' میں سے کسی 'حتمی مفہوم' کا تعین کریں گی۔

بسوخت عقل ز حیرت ایں چہ بوالعجبی است

عمر نوحؑ اور اقتباساتِ پرویز

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر پرویز صاحب ہی کے ماضی کے دو اقتباسات پیش کردیں تاکہ ان کی 'مفکر قرآن' ہونے کی حیثیت کے ساتھ 'شہنشاہِ تضادات' ہونے کی حیثیت بھی واضح ہوجائے:

''دورِ حاضر کے انسان کے لیے جو سوا سو سال کے عمر کے آدمیوں کو دور دور سے دیکھنے کے لیے آتا ہے، اور نہایت حیرت واستعجاب سے ان سے اس درازیٔ عمر کے اسباب دریافت کرتا ہے۔ اتنی لمبی عمر بمشکل یاد کیے جانے کے قابل ہے (اس وجہ سے بعض احباب عاماً سے مراد مہینے لینے پر مجبور ہو رہے ہیں) لیکن حضرت نوحؑ کا زمانہ قبل از تاریخ ہے جس کی تفاصیل کے متعلق ابھی تک بالتحقیق کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ (تورات کی رو سے) حضرت نوحؑ، حضرت آدمؑ سے دسویں پشت میں آتے ہیں اور ان کے تمام اسلاف کی عمریں آٹھ آٹھ نو نو سو سال کی لکھی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ایک ایسے بعید ترین زمانے میں جب ہنوز انسان کے اعصاب دورِ حاضر کے برق آگیں تمدن اور رعد آمیز فضا کے مہلک اثرات کا شکار نہیں ہوئے تھے اور اُسے ارضی و سماوی آفات کے مقابلے کے لیے قوی ہیکل جسم اور فولادی عضلات عطا کیے گئے تھے، اتنی لمبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمریں کچھ باعث تعجب نہیں ہوسکتیں''۔ (معارف القرآن: ج ۲ ص ۳۷۶)

اس اقتباسِ پرویز میں دو باتیں بالکل واضح ہیں:

اوّلاً یہ کہ...... وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ''حضرت نوحؑ کا زمانہ قبل از تاریخ ہے۔'' (حالانکہ 'مفہوم القرآن' کے حاشیہ صفحہ ۹۱۲ کی رُو سے وہ عمر نوحؑ کی بابت 'قرآنی ابہام' کی وضاحت کے لیے تاریخی تحقیقات کے منتظر رہے ہیں) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دورِ نوحؑ کا تعلق زمانہ قبل از تاریخ سے ہے تو پھر قرآن کے اس صاف اور صریح بیان کے بعد کہ ''نوحؑ ساڑھے نو سو سال اپنی قوم میں رہے۔'' ان تاریخی تحقیقات کا انتظار کس شوق میں کیا جارہا ہے جو اگر مل بھی گئیں تو ان کا مبنی برظن وتخمین ہونا واضح ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اگر صحت واستناد کے پہلو سے دیکھا جائے تو یہ 'تاریخی تحقیقات' (جن کی راہ میں 'مفکر قرآن' صاحب عمر بھر اپنی پلکیں بچھائے رہے) ضعیف سے ضعیف حدیث کے مرتبے کو بھی نہیں پہنچتیں لیکن ستیاناس ہو اس غلامانہ ذہنیت کا جو مغرب کی طرف سے آنے والی ہر مبنی برظن وتخمین ''تاریخی تحقیق'' کو تو مستند اور قابل اعتماد سمجھتی ہے اور احادیثِ رسول کو ظنی کہہ کر ردّ کردیتی ہے اور رجعت الی القرآن کے نعرہ کے تحت قرآنی تفسیر کو ان ہی 'تاریخی تحقیقات' کی روشنی میں مرتب کرتی ہے، اور یوں مغربی افکار ونظریات کو قرآن پر شرفِ تقدم عطا کرتی ہے۔لیکن اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر صاحبِ قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طرزِ عمل کی روشنی میں کرے تو یہی ذہنیت اسے 'عجمی اسلام' قرار دیتی ہے اور 'مفکر قرآن' اگر اشتراکیت اور مغرب کی فساد زدہ معاشرت اور حیاسوز تمدن کی روشنی میں تفسیر قرآن پیش فرمائیں تو گویا یہ 'خالص عربی اسلام' ہے۔

ثانیاً یہ کہ...... پرویز صاحب تورات کی بیان کردہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ''حضرت نوحؑ، آدمؑ سے دسویں پشت میں آتے ہیں۔'' اس سے یہ واضح ہے کہ آدم ایک مخصوص فرد کا نام ہے، ورنہ اگر آدمؑ سے مراد ہر فرد و بشر لیا جائے (جیسا کہ پرویز صاحب کا گمان ہے) تو نوحؑ اور ان کے درمیان دس پشتوں کا یہ فاصلہ بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِزالہ استبعادِ عقلی کے لیے ایک اور اقتباسِ پرویز

حضرت نوح علیہ السلام کی درازئ عمر پر عقلی استبعاد کے ازالہ کے لیے پرویز صاحب مزید فرماتے ہیں:

''چین کے مشہور مذہب TAOISM کا ایک بہت بڑا مبلغ اور رشی Kawag جس کی پیدائش چوتھی صدی ق م کی ہے، اپنی کتاب میں سمجھاتا ہے کہ عمر بڑھانے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ''میں بارہ سو سال سے اسی طریق کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم رو بہ انحطاط نہیں ہے۔'' (Sacred Book of the East (Taoism) Translated by Janes Legce, P.25)

(معارف القرآن: ج ۲/ حاشیہ بر صفحہ ۳۷۷)

نیرنگی دوراں دیکھئے کہ کل تک پرویز صاحب خود درازئ عمر کے عقلی استبعاد کا اِزالہ کرنے والوں میں تھے اور آج وہ خود اس عقلی استبعاد کا شکار ہوکر دور خیز اور خود ساختہ اُن ہی رکیک تاویلات قرآن پر اُتر آئے ہیں، جن کی وہ کل تردید کیا کرتے تھے۔

مزاجِ پرویز کا ایک بنیادی پہلو

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے مزاجِ پرویز کے ایک بنیادی پہلو کی نشاندہی ضروری ہے جس کا ظہور وصدور دیگر مقامات پر بالعموم اور یہاں بالخصوص ہوا ہے۔ پرویز صاحب اگر واقعی قرآن کو حجت اور سند سمجھتے تو ان پر لازم تھا کہ وہ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا سے ۹۵۰ سال ہی مراد لیتے۔ پھر جو کوئی اس طویل العمری پر شک وشبہ کا اظہار کرتا تو اسے یہ ہدایت فرماتے کہ وہ علمی انکشافات کا ابھی اور انتظار کرے تا آنکہ قرآن (وحی) کا یہ مفہوم ثابت ہوجائے۔'' یہی رویہ ان کے لیے زیبا تھا اور ایک مقام پر خود اُنہوں نے اسے اختیار بھی کیا تھا، چنانچہ قصہ صاحبِ موسیٰؑ کے ضمن میں اُنہوں نے یہی ہدایت فرمائی کہ

''عقل اپنی محدود معلومات کی بنا پر وحی کے کسی حکم کے خلاف اعتراض کرتی ہے، لیکن جب اس کی معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو کچھ وحی نے کہا تھا، وہ سچ تھا۔ لہٰذا عقل کے لیے صحیح روش یہی ہے کہ وہ وحی کی بات تسلیم کرنے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتی رہے۔ جب اسے صحیح معلومات حاصل ہوجائیں گی تو وہ خود بخود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وحی کی تصدیق کردے گی۔" (مفہوم القرآن: ص۶۷۹)

یہ وہ اُصولی بات ہے جس کی وہ تلقین کیا کرتے تھے لیکن یہاں ان کا اپنا طرزِ عمل اس تلقین کے برعکس ہے کہ وہ اب وحی کی بیان کردہ عمر نوحؑ کو عقلاً مستبعد سمجھتے ہیں اور قیاسات کی بنا پر آیات کی رکیک تاویلات پر تُل جاتے ہیں اور قرآنی الفاظ میں عمر نوحؑ کے متعلق ایک نیا تصور داخل کرتے ہیں اور زبانِ حال سے یہ فرماتے ہیں کہ "ان قیاسی مفاہیم کو قبول کرلو یہاں تک کہ علمی تحقیقات عمر نوحؑ کے کسی قطعی مفہوم کو سامنے لے آئیں۔ رہا قرآنِ کریم کا بیان کردہ مفہوم تو وہ 'غیر واضح' ہے۔"

اب ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل وہی شخص اختیار کرسکتا ہے جو قرآنی بیان پر یقین کرنے کی بجائے خارج از قرآن نظریات کے سامنے سر جھکا چکا ہو اور پھر اس کوشش میں جُت گیا ہو کہ قرآن چھیل چھال کر اپنے دل و دماغ میں رچے بسے خیالات کے مطابق ڈھال دیا جائے ورنہ قرآنِ مجید پر پختہ یقین اور مستحکم ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ طرزِ عمل کبھی اختیار نہیں کرسکتا۔

چوتھی مثال: قتل ابنائے بنی اسرائیل

یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ فرعونِ مصر نے ولادتِ موسیٰ سے قبل ابنائے بنی اسرائیل کو قتل کرنے کا ظالمانہ سلسلہ شروع کر رکھا تھا، خود قرآنِ مجید بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔ مگر طلوعِ اسلام کے روحِ رواں جناب غلام احمد پرویز کو اس سے انکار ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کے ہر اُس مقام پر جہاں فرعون کے ہاتھوں ابنائے بنی اسرائیل کا قتل مذکور ہے، اُنہوں نے یہ تاویل (بشرطیکہ اسے تحریف کی بجائے تاویل کہا بھی جاسکے) فرمائی ہے کہ فرعون اور آلِ فرعون فرزندانِ بنی اسرائیل کو "جوہر انسانیت سے محروم رکھنے کی کوشش" کیا کرتے تھے نہ کہ اُنہیں جان سے مار دینے کی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"يُذَبِّحُ أَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيِ نِسَآءَهُمْ" (القصص:۴) اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "وہ ان کے اَبناء کو قتل کرتا اور ان کی نساء کو زندہ رکھتا اور اس طرح اس میں فساد برپا کرتا رہتا" یہ الفاظ دو ایک دیگر مقامات پر بھی آئے ہیں۔ (مثلاً الاعراف:۱۲۷، غافر:۲۵، البقرۃ:۴۹) ہمارے ہاں ان الفاظ کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جتنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی بچے پیدا ہوں، ان میں سے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کردیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ یہ مفہوم صحیح نہیں، اسے تورات سے لیا گیا ہے۔"

(تفسیر مطالب الفرقان: ج۲ص۱۷۳)

ہمیں افسوس ہے کہ مقالہ کی تنگ دامنی نہ تو ہمیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اقتباسِ بالا میں سوے تعبیر کے ذریعہ جو کرشمہ سازی کی گئی ہے، اس کا پردہ چاک کیا جائے اور نہ ہی اس بات کی کہ موقفِ پرویز کے جملہ دلائل کا تفصیلی رد پیش کیا جائے اور نہ ہی اس امر کی کہ علماے سلف و خلف کے موقف کا دلائل و براہین سے اثبات کیا جائے۔ ان جملہ اُمور پر تفصیلی بحث کے لیے میری کتاب 'تفسیر مطالب الفرقان کا علمی اور تحقیقی جائزہ' کا مطالعہ فرمائیے۔

یہاں موضوع کی مناسبت سے صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ 'مفکر قرآن' کے ایمان بالقرآن کی حقیقت کیا ہے؟

انکارِ قتل ابناے بنی اسرائیل کی وجہ

چنانچہ وہ جس وجہ سے قتلِ ابناے بنی اسرائیل کا انکار کرتے ہیں، وہی اس امر کو واضح کردیتی ہے کہ وہ فی الواقع قرآن کو مانتے ہیں یا غیر قرآن کو؟ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

"اس وقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جس قدر پردے اُٹھے ہیں، ان میں سے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کردینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا ہے۔ ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو، اس وقت تک صرف تورات میں یہ ملتا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو مارنے کا حکم دے رکھا تھا۔ (کتابِ خروج) لیکن تاریخی نقطۂ نگاہ سے موجودہ تورات کی جو حیثیت ہے وہ اربابِ علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

(لغات القرآن: ص۶۹۳،۶۹۴)

'مفکرِ قرآن' کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری

اقتباسِ بالا نے پرویز صاحب کی مغرب کے مقابلے میں ذہنی غلامی اور فکری اسیری کو بالکل بے نقاب کرکے رکھ دیا ہے۔ قرآنِ کریم بالفاظ صریحہ فرعون کے متعلق یہ کہتا ہے کہ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ (القصص:۴) "وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کیا کرتا تھا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کی عورتوں کو زندہ رکھا کرتا تھا'' فرعونیوں کے متعلق بھی قرآن صراحت سے بیان کرتا ہے کہ "یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ ھُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَ کُمْ" (البقرۃ:۴۹) ''وہ تمہارے بچوں کو ذبح کیا کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیا کرتے تھے۔'' ایک دوسرے مقام پر "یذبحون" کی جگہ "یُقَتِّلُوْنَ" کے الفاظ آئے ہیں یعنی ''خوب قتل کیا کرتے تھے۔'' الغرض قرآن کریم نے یذبحون کہا ہو یا یقتلون، دونوں کا معنی 'جان سے مار ڈالنا' ہی ہے۔ لیکن ہمارے 'مفکر قرآن' کو یہ حقیقی اور عام فہم مفہوم قابل قبول نہیں کیوں؟ محض اس لیے کہ ابھی تک حجری اور اثری انکشافات نے اس معنی کی تصدیق نہیں کی۔ گویا اصلی قابل اعتماد ماخذ الفاظ کلام اللہ نہیں ہیں بلکہ تاریخی آثار اور انکشافاتِ آثار قدیمہ ہیں۔ لہٰذا قرآنی مفہوم ان ہی کی روشنی میں متعین کیا جائے گا یعنی قرآنی الفاظ کا مفہوم قطعی نہیں بلکہ تاریخی آثار و کتبات سے برآمد شدہ مفہوم ہی قطعی ہے۔ یہ رویہ مغرب کی انتہائی ذہنی غلامی کا غماز ہے۔

'مفکر قرآن' پڑھتے تو قرآن ہی رہے ہیں مگر سوچتے رہے ہیں تہذیب غالب کی تحقیقات کی روشنی میں۔ آنکھیں تو اُن کی اپنی تھیں مگر دیکھتے رہے ہیں مغرب کے زاویۂ نگاہ سے۔ کان تو اُن کے اپنے ہی تھے، مگر سنتے رہے ہیں علمائے مغرب کی سخن سازیاں۔ الفاظ تو وہ قرآن ہی کے اپنی زبان سے ادا کرتے رہے ہیں مگر ان کے اندر معانی وہ فکر جدید سے لے کر داخل کیا کرتے تھے۔ زبان تو ان کی اپنی تھی، مگر بات غیروں ہی کی کیا کرتے تھے۔ دماغ تو ان کا اپنا ہی تھا مگر اس میں سوچ اور فکر اَغیار ہی کی تھی: ﴿لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ﴾

(الاعراف:۱۷۹)

مزید برآں ہمارے 'مفکر قرآن' ہوں یا دیگر منکرینِ حدیث، اُن کی یہ بات کس قدر قابل توجہ ہے اور موجب صد حیرت ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے متعلق بخاری، مسلم، موطا اور دیگر کتبِ حدیث کی شہادتوں کو بلا تکلف ردّ کر دیتے ہیں اور محققین مغرب کی آثارِ قدیمہ سے ماخوذ تاریخی شہادت کو قبول کر لیتے ہیں حالانکہ یہ تاریخی شہادتیں اُن شہادات کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں رکھتیں جو نبی اکرم ﷺ کے متعلق احادیث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں پائی جاتی ہیں۔ منکرین حدیث مغرب کی جن تاریخی شہادتوں پر اعتماد کرتے ہیں، ان میں سے قوی سے قوی ذریعہ بھی ابن ماجہ، حاکم، بیہقی کی ضعیف سے ضعیف روایت کے مقابلہ میں بھی ہیچ ہے۔ لیکن بُرا ہو ذہنی غلامی کا، ستیاناس ہو دماغی مغلوبیت کا، بیڑہ غرق ہو فکری اسیری کا، جس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

ہمارے 'مفکر قرآن' فرماتے ہیں کہ قتل ابنائے بنی اسرائیل کو مقتول و مذبوح قرار دینے والی آیات میں 'جان سے مار ڈالنے' کا مفہوم اس لیے قابل قبول نہیں کہ ''اس وقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جس قدر پردے اُٹھے ہیں، ان میں سے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا ہے، ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قرآنی الفاظ کے قطعی مفہوم کو نظر انداز کر کے مصر کی تاریخ پر سے مزید پردوں کے اُٹھنے کا انتظار کرتے کرتے وہ شخص مر گیا جو اُٹھتے بیٹھتے قرآن قرآن کی رٹ لگائے رکھتا تھا اور قرآن کے اوّل و آخر سند ہونے کی دہائی دیا کرتا تھا۔ اب گویا حیاتِ پرویز ہی میں جب اثری تحقیقات میں سے کوئی ایسی شہادت مل جاتی جو ولادتِ موسیٰ علیہ السلام کے وقت اسرائیلی بچوں کو جان سے مار ڈالنے' کا انکشاف کر ڈالتی تو پھر 'مفکر قرآن' ایک اور قلابازی کھاتے اور مفہوم قرآن از سر نو بدل کر کچھ اور ہو جاتا اور جب تک کوئی ایسی شہادت نہیں مل پاتی اس وقت تک 'پیروانِ دعوتِ قرآنی' پر لازم ہے کہ وہ 'مفکر قرآن' کے انداز اُپنائے ہوئے قیاسی معانی ہی کو سینے سے لگائے رکھیں۔

تورات اور پرویز

اور یہ بھی کیا خوب کہا ہے کہ ''اسرائیلی بچوں کو سچ مچ مار ڈالنے کا فرعونی حکم صرف تورات میں پایا جاتا ہے مگر موجودہ تورات 'ساقط الاعتبار' ہے۔'' یہاں ہمارے 'مفکر قرآن' کا یہ دورُخا پَن بھی قابل غور ہے کہ اُنہوں نے جب اور جہاں چاہا تورات کے اُن واقعات کو بھی جو مطابقِ قرآن ہیں یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ واقعات تورات جیسی ساقط الاعتبار کتاب سے ماخوذ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں'' (مثلاً یہی قتل ابنائے بنی اسرائیل کے واقعات) لہٰذا ناقابل قبول ہیں۔لیکن دوسری طرف توراتِ محرفہ کے جن واقعات کو وہ اپنے منسوب الی القرآن تصورات کے موافق پاتے ہیں اُنہیں وہ ہاتھوں ہاتھ قبول کرلیتے ہیں (مثلاً نظامِ یوسفی میں اقتصادی نظام) پھر اُس وقت نہ تورات اُنہیں تحریف شدہ نظر آتی ہے اور نہ ہی ساقط الاعتبار۔

پھر 'مفکر قرآن' صاحب کا یہ دورُخا پَن بھی ملاحظہ فرمایئے کہ قرآنِ کریم اگر یہ کہہ دے کہ ''فرعون ابنائے بنی اسرائیل کو قتل اور ذبح کیا کرتا تھا اور ان کی خواتین کو زندہ رکھا کرتا تھا'' تو یہ قرآنی بیان 'مفکر قرآن' کے لیے قابل قبول نہیں ہے اور اسے مردود قرار دینے کے لیے یہ فرماتے ہیں کہ ''یہ تورات جیسی ساقط الاعتبار کتاب سے ماخوذ تصور ہے۔'' لیکن دوسری طرف وہ خود ایک ایسی ہی حقیقت کو جب اہل کتاب کی مذہبی کتابوں سے پیش کرتے ہیں تو بغیر کسی تردد، دغدغہ، تامل اور حیل و حجت کے 'حقیقتِ واقعہ' قرار دے کر قبول کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''انجیل متی میں یہ بھی مذکور ہے کہ ہیرودلیس نے بیت اللحم اور اس کی سرحدوں کے تمام بچوں کو جن کی عمر دو برس یا اس سے کم تھی، قتل کر دیا تھا۔'' (شعلہ مستور: حاشیہ بر ص ۱۶)

غور فرمایئے، انجیل متی کی سند پر ہیرودلیس کا قتل اطفال مسلّم و معتبر ہے لیکن قرآن کی سند پر قتل اطفال بنی اسرائیل غیر مسلّم ہے: شعور وفکر کی یہ کافری معاذ اللہ!

ایک قابل غور امر

قرآنِ کریم نے ابنائے بنی اسرائیل کی ہلاکت کے سلسلہ میں تقتیل اور تذبیح کے الفاظ استعمال کئے ہیں جو قتل اور ذبح کے الفاظ سے نکل کر باب تفعیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قتل یا تقتیل (جس کے 'مفکر قرآن' نے چھ معانی کے چوہے جبل لغات سے کھود نکالے ہیں) کی وضاحت ذبح (یا تذبیح) کے لفظ سے فرمادی ہے، جس کا واحد معنی 'جان سے مار ڈالنا' ہی ہے۔ 'مفکر قرآن' اس خدائی وضاحت کو نظر انداز کر ڈالتے ہیں کیوں؟ کس لئے؟ صرف اور صرف اس لیے کہ اُنہیں اپنے 'مزعومات' قرآنی حقائق کی نسبت زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔ یہ 'مزعومات' دراصل وہ تصورات ہیں جو مغرب کی ذہنی غلامی اور فکری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسیری کے باعث اُنہوں نے اپنے قلب و دماغ میں راسخ کر رکھے ہیں اور اب ان ہی کی تائید کے لیے ایک طرف وہ تفسیر قرآن کی آڑ میں حدِ تحریف کو پہنچی ہوئی رکیک و خسیس تاویلات کے درپے رہتے ہیں اور دوسری طرف مصری کتبات، آثارِ قدیمہ کی تحقیقات اور مزید تاریخی انکشافات کے منتظر رہتے ہیں جو اُن کے نزدیک قرآن سے بھی بڑھ کر قطعی الثبوت ہیں تاکہ ان کی روشنی میں تقتیل ابناء والی قرآنی آیات کے مفہوم کو متعین کیا جاسکے، حالانکہ تاریخ اور قرآن کی حیثیت کو بہ تکرار و اعادہ وہ یوں بیان کیا کرتے ہیں کہ

''تاریخ بہرحال ظنی ہے اور اس کے مقابلہ میں قرآن ایک یقینی شہادت ہے۔''

(طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۶۵ء، ص ۴۹)

لیکن یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ 'مفکر قرآن' جو ہمیشہ عقل و دانش کی روشنی میں قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کرنے کے مدعی رہے ہیں قرآن کی قتل اطفال اور ذبح ابناء بنی اسرائیل سے متعلقہ آیات (جو قرآن ہونے کی بنا پر قطعی اور یقینی ہیں) کی تفسیر تاریخی آثارِ مصر سے کرنا چاہتے ہیں جن پر سے اٹھنے والے پردوں کے بعد بھی جو کچھ سامنے آئے گا، وہ بہرحال ظنی ہی ہوگا۔

پانچویں مثال: واقعہ قتل نفس اور ذبح بقرہ

سورۃ البقرۃ میں ذبح البقرہ کے واقعہ کے ضمن میں قتلِ نفس کا واقعہ بایں الفاظ مذکور ہے:

﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾

''اور تمہیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کو مار ڈالا تھا، تب اس ضمن میں باہم جھگڑے اور ایک دوسرے پر الزامِ قتل تھوپنے لگے اور اللہ اُس امر کو کھولنے والا تھا جسے تم چھپا رہے تھے۔ تب ہم نے کہا: لاشِ مقتول کو اس کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ، دیکھو! اللہ یوں اپنی نشانیاں دکھاتے ہوئے لوگوں کو زندگی بخشتا ہے تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔'' (البقرۃ:۲:۷۲،۷۳)

اس آیت کی تفسیر میں قریب قریب جملہ علمائے تفسیر نے یہ لکھا ہے کہ جس گائے کو ذبح کرنے کا حکم اس سے متصل پہلی آیات میں دیا گیا ہے، اسی کے گوشت کو مقتول کی لاش کے ساتھ لگانے کا حکم دیا گیا ہے: فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا (البقرۃ:۷۳) اس کے نتیجہ میں مقتول کچھ دیر کے لیے زندہ ہوا اور اپنے قاتل کا نام بتا کر ہمیشہ کے لیے پھر موت کی نیند سو گیا اور قاتل کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے جرم کی سزا دے دی گئی۔

تفسیر قرآن میں اَحوط و انسب رویہ

لیکن پرویز صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں علماء کے اس تفسیری موقف کو نظر انداز کر کے ایک ایسی بات کہی ہے جو کسی حد تک ان کے اَنسب و احوط رویہ کی غماز ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اضربوہ ببعضها کی تفسیر میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہوگیا ہے لیکن بایں ہمہ بات ویسی کی ویسی ہی مشکل رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور اس کا صحیح مفہوم تاریخی انکشافات کی روشنی میں ہی متعین ہوسکتا ہے جس طرح فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کا بیان ایک تاریخی واقعہ تھا۔ صدیوں تک اس آیت کی تفسیر میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہیں لیکن جب تاریخ نے اپنے چہرہ سے نقاب اُٹھایا تو مصر کے تہہ خانہ میں اس آیت کی تفسیر مجسم نظر آ گئی۔ اسی طرح محولہ صدر واقعہ بھی تاریخ سے متعلق ہے قیاس آرائیوں سے اس کا صحیح مفہوم متعین نہیں ہوسکتا۔ یہ آیت بھی ابھی متشابہات کی فہرست میں ہے، تاریخ اپنا کوئی اور ورق الٹے گی تو اس وقت یہ آیت محکمات کی فہرست میں منتقل ہوجائے گی۔ قرآنی حقائق و معارف زمانہ کے شکن در شکن گیسوؤں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ علم انسانی کی نسیم سحری جوں جوں ان پیچوں کو کھولتی جاتی ہے یہ گوہر آبدار حسین آویزوں کی طرح وجہِ درخشندگی عالم ہوتے جاتے ہیں۔" (معارف القرآن: ج۳/ص ۳۵۶)

یہ تفسیری موقف پرویز صاحب نے ۱۹۳۵ء میں اختیار کیا تھا جس کے تحت ایسی آیات کو متشابہات میں سمجھتے ہوئے اس کی تفسیر کو یہ کہہ کر معرضِ اِلتوا و انتظار میں ڈال دیا تھا کہ "جب تک تاریخ اس طرح کی کوئی مجسم تفسیر پیش نہیں کر دیتی جیسی کہ فرعون کے بدن کو محفوظ رکھنے والی آیت میں پیش کی گئی ہے، اس وقت تک اسے متشابہات میں سے ہی سمجھا جائے گا۔" نیز اُنہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ 'قتل نفس' کے زیر بحث واقعہ میں بھی 'قیاس آرائیوں' سے اس کا مفہوم متعین نہیں ہوسکتا۔

کاش! 'مفکر قرآن' اپنے اس اُصول پر قائم رہتے اور تفسیر قرآن میں اپنی رائے، ظن اور گمان کو دخیل نہ بناتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد ان کی فضاے دماغی میں ایک لہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُٹھی اور ظن وتخمین اور گمان وتخریص پر مبنی ایک خالص قیاسی تفسیر بایں الفاظ صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہوگئی:

''ہم جو کچھ سمجھ سکے ہیں، وہ یہ ہے کہ توہم پرستیوں سے لوگوں کی نفسیاتی حالت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ ذرا سے خلافِ معمول واقعہ کا سامنا نہیں کرسکتے اور اس کے احساس سے ان پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہوچکی تھی اور واقعۂ قتل میں ان کی نفسیاتی حالت کو تحقیق مجرم کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ مشتبہ ملزموں میں سے ایک ایک شخص، لاش کے قریب سے گزرے اور لاش کا کوئی حصہ اُٹھا کر اس شخص کے جسم سے چھوا جائے، ملزم کی پہچان ہوجائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مجرم کی جو حالت ہوئی ہوگی، وہ اس کے داخلی احساسات کی غماز بن گئی ہوگی۔ اس طرح جب مجرم کا تعین ہوگیا تو اس سے قصاص لے لیا گیا۔ قرآن نے قصاص کے متعلق کہا ہے کہ اس میں رازِ حیات ہے۔ یہ بہرحال ہمارا قیاس ہے حقیقت اس وقت ہی سامنے آئے گی جب تاریخی انکشافات اس کی نقاب کشائی کریں گے۔'' (برقِ طور: ص۱۹۰،۱۹۱)

پھر اس 'قیاسی تفسیر' کو جس کے متعلق خود اُن کا اپنا اعتراف ہے کہ ''یہ ہمارا قیاس ہے۔'' عین مفہوم قرآن بنا کر یوں پیش کرتے ہیں:

''ایک طرف تمہاری یہ حالت کہ ایک جانور کو ذبح کرنے میں اس قدر حیل وحجت اور دوسری طرف یہ عالم کہ ایک انسانی جان ناحق لے لی اور اسے خفیہ طور پر مار دیا اور جب تفتیش شروع ہوئی تو لگے ایک دوسرے کے سر الزام تھوپنے یعنی تم میں اتنی اخلاقی جرات بھی نہ تھی کہ جرم ہوگیا تو کھلے بندوں اس کا اعتراف کرلیتے، لیکن جس بات کو تم چھپانا چاہتے تھے، خدا اُسے ظاہر کردینا چاہتا تھا تاکہ جرم بلاقصاص نہ رہ جائے۔

مشرکانہ توہم پرستیوں سے جن میں تم مبتلا ہوچکے تھے، انسان کی نفسیاتی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ اسے کسی ذراسی خلافِ معمول بات کا سامنا کرنا پڑے تو اس پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ (۲۲/۳۱) چونکہ خدا تمہاری اس نفسیاتی کیفیت سے واقف تھا، اس نے قاتل کا سراغ لگانے کے لیے ایک نفسیاتی ترکیب بتائی (جو انسان کی اُس زمانے کی ذہنی سطح کے اعتبار سے بڑی خلافِ معمول تھی) اُس نے کہا: تم میں سے ایک ایک جاؤ اور اپنے حصہ جسم کو لاش کے ساتھ لگا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دو۔ (چنانچہ جو مجرم تھا، وہ جب لاش کے قریب پہنچا تو خوف کی وجہ سے اس سے ایسے آثار نمایاں ہوگئے جو اس کے جرم کی غمازی کرنے کے لیے کافی تھے) اس طرح اللہ نے اس قتل کے راز کو بے نقاب کردیا اور مجرم سے قصاص لے کر موت کو زندگی سے بدل دیا کیونکہ قصاص میں قوم کی حیات کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ (۲/۱۷۹) اللہ اس طرح اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل وشعور سے کام لے کر ایسے معاملات کو سلجھایا کرو اور اس حقیقت کو سمجھ لو کہ نفسیاتی تغیر سے (افراد سے آگے بڑھ کر) کس طرح خود قوموں کی حالت بدل جاتی ہے۔''

(مفہوم القرآن: ص ۲۵)

قرآنی الفاظ کے اختصار کو بھی دیکھئے اور پھر انہی الفاظ کے مفہوم کے طول وعرض کو بھی اور سوچئے کہ اگر یہی قرآنی مفہوم ہے تو کیا عرب کے اَن پڑھ اور سادہ مزاج بدوؤں کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ مفہوم آسکا ہوگا جبکہ اس مفہوم سے خود 'مفکر قرآن' بھی بایں علم و دانش اور حکمت وفضیلت ۱۹۳۵ء تک محروم تھے۔ پھر اس 'مفہوم القرآن' کو اس پہلو سے بھی دیکھئے کہ اس میں کس قدر قرآنی الفاظ کی رعایت پائی جاتی ہے اور کس قدر 'مفکر قرآن' کے اپنے قیاس وگمان کا دخل ہے۔ پھر یہ کہ قیاس وگمان اور لفاظی کا یہ مرکب ایک سادہ اور عام فہم عرب کو قرآن سے قریب تر کرے گا یا بعید تر؟ یہ ہر شخص خود محسوس کرسکتا ہے۔

پرویز صاحب کے اس 'مفہوم القرآن' کے مقابلہ میں مندرجہ ذیل مفہوم آیات کو بھی ملاحظہ فرمایئے جسے قرآنی الفاظ کی حدود میں رہ کر اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ قرآنی ترجمہ اور شرحِ مفہوم میں ربط وہم آہنگی نمایاں ہوجاتی ہے اور عبارت بھی الفاظ کے اِسراف وتبذیر سے قطعی پاک ہے:

''اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کردیا پھر (اپنی براءت کے لئے) ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور اللہ کو اس امر کا ظاہر کرنا مقصود تھا جس کو تم (میں سے مجرم ومشتبہ لوگ) مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے (ذبح بقرہ کے بعد) ہم نے حکم دیا کہ اس (مقتول کی لاش) کو اس (بقرہ) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھو دو (چنانچہ چھوانے سے وہ زندہ ہوگیا۔ آگے اللہ تعالیٰ بمقابلہ منکرین قیامت کے اس قصہ سے استدلال اور نظر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کردیں گے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ تعالیٰ اپنے نظائر (قدرت) تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو (اور ایک نظیر سے دوسری نظیر کے انکار سے باز آؤ)۔

(تفسیر معارف القرآن از مفتی محمد شفیعؒ: ج ۱ رص ۲۴۶)

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ 'مفکر قرآن' کا کسی 'تاریخی انکشاف' کا انتظار بھی کوئی خوشگوار موقف نہیں ہے لیکن اس کی بجائے اپنے قیاس وگمان پر مبنی موقف کو الفاظ کا بے تحاشا اسراف کرتے ہوئے لفاظی اور وہم وگمان کے مرکب کی شکل میں 'مفہوم القرآن' کے نام سے پیش کرنا اس سے بھی بدتر عمل ہے۔ اعاذنا الله من ذلك! یہ بحث اور یہ واقعہ بھی 'مفکرِ قرآن' کے ایمان بالقرآن کی حقیقت کو بے نقاب کر ڈالتا ہے۔

چھٹی مثال: رہبانیتِ مریم کی بابت خود ساختہ داستانِ پرویز

یہود بے بہبود نے حضرت مریمؑ پر نہایت شرمناک الزامات لگائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، نقل کفر کفر نباشد) براہِ راست ولد الزنا قرار دیا لیکن اس کے مقابلہ میں 'مفکر قرآن' نے اپنی ایک من گھڑت داستان کی رُو سے حضرت مریمؑ پر یہی الزام بالواسطہ اس طرح عائد کیا:

''حضرت مریمؑ ایک راہبہ کی زندگی بسر کر رہی تھیں جسے دنیاوی علائق سے کچھ واسطہ نہیں ہونا چاہئے تھا بلکہ ساری عمر تجرد میں گزار دینی چاہئے تھی۔ آپ کو خدا کی طرف سے اشارہ ملا کہ اُنہیں متاہل زندگی بسر کرنی ہوگی کیونکہ اُنہیں ایک عظیم الشان رسول کی امین بننا ہے۔ اس طے شدہ اَمر (اَمْرًا مَّقْضِيًّا) کے مطابق حضرت مریمؑ نے خانقاہ کی زندگی چھوڑ کر عائلی زندگی اختیار کی، لیکن یہودیوں کے نزدیک یہ کوئی چھوٹا جرم نہ تھا۔ ایک راہبہ کی زندگی چھوڑ کر متاہل زندگی اختیار کر لینا، مشربِ خانقاہیت میں اِرتداد سے کم نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس جذبۂ انتقام اور شکستِ پندار کو بھی ملحوظ رکھئے جو حضرت مریمؑ کی اس روش سے اُن کے دلوں میں پیدا ہوا تھا کہ اُنہوں نے ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ شادی نہیں کی اور ہیکل سے باہر ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ ان وجوہات کی بنا پر اُنہوں نے حضرت مریمؑ کو موردِ طعن وتشنیع بنایا اور اپنے جوشِ انتقام میں، اس پیکرِ عفت وعصمت کے خلاف طرح طرح کے الزامات تراشے: ﴿وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا﴾ (النساء:۱۵۶) یعنی ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نزدیک ایک راہبہ کا اس طرح کا نکاح، نکاح ہی نہیں قرار پاسکتا تھا، اس لیے اُس کی اولاد کس طرح مستحسن نظروں سے دیکھی جاسکتی تھی''۔ (شعلۂ مستور: ص ۱۱۴)

اس اقتباس کے پہلے ہی جملے میں واقع لفظ 'راہبہ' کے تحت حاشیہ میں 'مفکر قرآن' صاحب لکھتے ہیں:

''خانقاہیت کی زندگی مذہب عیسویت کی ایجاد نہیں۔ اس کے آثار اس سے پہلے یہودیوں کے ہاں بھی موجود تھے اور مصریوں میں بھی۔ خود حضرت مریمؑ کی ابتدائی زندگی کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ یروشلم کے ہیکل میں راہب اور راہبات ہوتی تھیں۔ یہ تارک الدنیا لوگ، عبادت میں مصروف رہتے اور انبیاے یہود کی پیشینگوئیوں کے تحت ایک آنے والے مسیح کا انتظار کرتے۔'' (شعلۂ مستور: حاشیہ بر صفحہ ۱۱۴)

'مفکر قرآن' کی اس داستانِ زُور کے نتیجہ میں چونکہ حضرت مریمؑ ایک راہبہ کی زندگی بسر کررہی تھیں اور پھر چونکہ ایک راہبہ کی زندگی چھوڑ کر ''متاہل زندگی اختیار کرلینا، مشرب خانقاہیت میں ارتداد سے کم نہ تھا'' اس لیے ''اس طرح کا نکاح، نکاح ہی قرار نہیں پاسکتا تھا'' لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اس پرویزی کہانی کی بدولت بھی ویسی ہی غیر مستحسن تھی جیسی یہود کے ہاں تھی۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ یہود نے براہِ راست حضرت مریمؑ پر الزام لگایا اور 'مفکر قرآن' نے اپنی خود ساختہ کہانی کی بنا پر بالواسطہ یہی الزام عائد کیا۔

پرویزی داستان میں 'غیر قرآنی اجزا'

بہرحال 'مفکر قرآن' کی من گھڑت کہانی میں کم از کم مندرجہ ذیل چار اجزا وہ ہیں جو قرآن میں ہرگز ہرگز مذکور نہیں ہیں:

1. ایک تو یہ کہ مریمؑ راہبہ کی زندگی گزار رہی تھی۔
2. ثانیاً یہ کہ رہبانیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے وجود پذیر تھی۔
3. ثالثاً یہ کہ حضرت مریمؑ ایسی راہبہ کی زندگی گزار رہی تھیں جن کو ساری عمر تجرد میں گزارنا تھی۔
4. رابعاً یہ کہ رہبانیت کی زندگی چھوڑ کر عائلی زندگی گزارنے پر یہودی اُنہیں موردِ طعن وتشنیع قرار دیتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآنِ مجید سے ان چاروں باتوں کا کہیں سراغ نہیں ملتا اور ملے بھی کیسے جبکہ یہ ساری داستانِ زُور تقریباً دو ہزار سال بعد 'مفکرِ قرآن' کے سامری دماغ نے خود تراشی ہے، اس کے لیے سارا مواد محرف انجیلوں اور ان مغربی دانشوروں کی اَہوا سے ماخوذ ہے جن کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں وہ مبتلا تھے، کیونکہ از روے قرآن نہ تو حضرت مریمؑ راہبہ تھیں (کیونکہ رہبانیت اس کے بعد پیروانِ مسیح کی ایجاد تھی) اور نہ ہی والدۂ مریمؑ کے ذہن میں اُنہیں نذرِ ہیکل کرتے وقت یہ خیال تھا کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کرے گی اور اس کی اولاد نہیں ہوگی بلکہ اس کے برعکس اُن کی اَزدواجی زندگی اور پھر اس کے نتیجہ میں اُن کی ذرّیت کا شعور رکھتے ہوئے ہی وہ اپنی دعاء اِعاذہ میں اُن کا ذکر کررہی تھیں: ﴿إِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ (آل عمران:۳۶) نیز نہ ہی از روے قرآن اُس وقت رہبانیت کا نظام رواج پذیر تھا کیونکہ اس نظامِ رہبانیت کی ابتدا وابتداع، بعد میں پیروانِ مسیح کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ چنانچہ خود 'مفکر قرآن' صاحب مفہومِ آیات کے نام سے الفاظ کا جو کباڑ خانہ پیش کیا کرتے تھے، ان میں بھی اس مسلک کو متبعین عیسیٰؑ کا ایجاد کردہ مسلک قرار دیا گیا ہے:

> ''پھر ہم نے ان کے بعد انہی کی نہج پر اور رسول بھی بھیجے اور (سلسلۂ بنی اسرائیل میں) سب سے پیچھے عیسیٰ ابن مریمؑ کو بھیجا اور اسے انجیل دی۔ جو لوگ اس کی پیروی کرتے تھے ان کے دل میں خلق خدا کے لیے شفقت اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کردیئے (یعنی عیسیٰؑ کی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا)۔ باقی رہا مسلکِ رہبانیت (خانقاہیت) جسے تم اس وقت ان کے ہاں مروّج دیکھتے ہو تو اسے اُنہوں نے از خود وضع کرلیا تھا۔''
>
> (مفہوم القرآن: ج۳/ص ۱۲۸۴)

مزید برآں رہبانیت کی بابت واقع لفظ ابتدعو کے مادہ (ب د ع) کے متعلق خود پرویز صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ

> ''البدع وہ کام جو پہلے پہل ہوا ہو اور اس سے پہلے اس کی مثال موجود نہ ہو۔ (ابن فارس) وہ رسی جسے پہلی بار نئے ریشے سے بٹا گیا ہو۔ "ركية بديعة" نیا کھودا ہوا کنواں۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں با کے ساتھ دال آئے، ان میں ابتداء اور ظہور کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔'' (لغات القرآن: ج۱/ص ۳۰۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایمان قرآن پر یا غیر قرآن پر؟

یہاں پہنچ کر 'مفکر قرآن' جناب چودھری غلام احمد پرویز کے ایمان بالقرآن کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ایک طرف قرآن یہ کہتا ہے کہ مسلکِ رہبانیت کے موجد عیسائی تھے۔ قبل ازیں، اس کا وجود تک نہ تھا اور دوسری طرف 'مفکر قرآن' صاحب محض اپنی نرالی اُپچ کی لاج رکھنے کی خاطر یا علماے مغرب کی تقلید میں یہ کہتے ہیں کہ رہبانیت، عیسائیوں کی ایجاد نہیں بلکہ ان سے بہت پہلے یہودیوں اور مصریوں میں یہ مسلک رائج تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایمان بالقرآن کا تقاضا کیا ہے؟ قرآن کی بات مانی جائے یا غیر قرآن کی؟ فرمانِ خداوندی قابل تسلیم و اطاعت ہو یا اقوالِ علماے مغرب؟ ایک سچی اور محفوظ کتاب کی بات مانی جائے یا جعلی اور محرف کتاب کی؟ اگر قرآنی حقائق اور اکتشافاتِ مغرب میں تعارض و تضاد پایا جائے تو کسے قبول کیا جائے اور کسے ردّ کیا جائے؟ آپ جو عمل بھی یہاں اختیار کریں گے وہ آپ کے اصل ایمان و اعتقاد کو ظاہر کردے گا۔ اگر قرآن کی بات مانیں گے تو آپ کے ایمان بالقرآن کی عملاً تصدیق ہوجائے گی، اگر آپ آراے علماے مغرب کو تسلیم کریں گے تو (قرآن کی بجائے) اُن پر آپ کا اعتقاد و ایمان واضح ہوجائے گا اور آراے مغرب کو شرفِ تقدم بخشنے کا آپ کا یہ عمل اُس زبانی کلامی ایمان کی تردید کرڈالے گا جو قرآن کے بارے میں آپ ظاہر کرتے ہیں۔ فی الواقع انسان کا عملی رویہ ہی وہ معیار ہے جو یہ واضح کرڈالتا ہے کہ اس کا ایمان و اعتقاد قرآن پر ہے یا غیر قرآن پر۔

حقیقت یہ ہے کہ جس قرآن کے واحد مسند اور تنہا حجت ہونے کا ڈھنڈورا 'مفکرِ قرآن' پیٹا کرتے تھے۔ اس پر ان کا زبانی کلامی ایمان ہوتو ہو، عمل کی دنیا میں خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی اس کے اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ وہ اپنی عملی زندگی میں قرآن کے نہیں بلکہ مغرب ہی کے پیروکار تھے قرآن کے نام پر جو کچھ وہ عمر بھر پیش کرتے رہے ہیں، وہ سب کچھ بغیر کسی قرآن کے مغرب میں موجود ہے۔ مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، ترکِ حجاب، مردوزن کی مطلق مساوات (بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نظریۂ افضلیتِ اُناث)، درونِ خانہ فرائض نسواں کی بجائے اُنہیں بیرونِ خانہ مشاغل میں منہمک کرنا، تعددِ ازواج کو معیوب قرار دینا، عورت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خانگی مستقر سے اُکھاڑ کر اسے مردانہ کارگاہوں میں دھکیل دینا، خانگی زندگی میں عورت کو اس کے فطری وظائف سے منحرف کرکے اُسے قاضی و جج بلکہ سربراہِ مملکت تک کے مناصب پر براجمان کرنا وغیرہ جملہ اُمور میں سے آخر وہ کون سا امر ہے جسے 'مفکر قرآن' نے کتاب اللہ میں سے کشید کر ڈالنے میں زحمت کشی نہ کی ہو اور وہ مغرب میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ وہ اشتراکیت جس کا چوہا جبل قرآن سے کھود نکالنے میں 'مفکر قرآن' نے بڑی زحمت اور مشقت اُٹھائی ہے وہ اُن کے ایسا کرنے سے بہت پہلے روس، چین اور دیگر ممالک میں موجود تھی۔ 'مفکر قرآن' کا اس باب میں اصل 'اجتہادی کارنامہ' یہ ہے کہ اُنہوں نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے، اسے مغرب کی اصطلاحوں میں پیش کرنے کی بجائے اپنی اصطلاحوں میں پیش کیا ہے مثلاً وہ اشتراکیت کو پیش کرتے ہیں تو اس کے اصل نام کے ساتھ نہیں بلکہ 'نظام ربوبیت' کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ کارل مارکس کی 'جدلی مادیت' کا فلسفہ ان کے ہاں 'حق و باطل کی کشمکش' قرار پاتا ہے۔ 'تاریخی وجوب' کی قوت کو وہ 'زمانے کے تقاضے' کہہ دیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ زہر ہلاہل کی بوتل پر آبِ حیات کا لیبل چسپاں کردینے سے زہر کی اصل حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔

الغرض قرآنِ کریم کا بیان یہ ہے کہ رہبانیت کی ابتداء و ابتداع عیسائیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی، لیکن ہمارے 'مفکر قرآن' صاحب اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے کا قائم شدہ مسلک قرار دیتے ہیں۔ قرآن کے مقابلہ میں غیر قرآنی تصورات کو ترجیح دینا 'مفکر قرآن' کے ایمان بالقرآن کی حقیقت کو آفتابِ نصف النہار کی طرح واضح کردیتا ہے۔

ساتویں مثال: ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام؛ قرآن اور 'مفکر قرآن'

اس آخری مثال میں اس امر کا پھر جائزہ لیا جارہا ہے کہ زیر بحث معاملہ میں پرویز صاحب اپنے عقائد و تصورات کو تابع قرآن رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس ضمن میں اُنہوں نے جو کچھ بھی لکھنا تھا وہ اپنی کتاب 'شعلۂ مستور' میں لکھ چکے ہیں کیونکہ باقی ہر جگہ وہ یہی فرماتے ہیں کہ جسے تفصیل درکار ہو، وہ شعلۂ مستور کی طرف رجوع کرے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں ان کے افکار و نظریات کی آخری ترجمان یہی کتاب ہے، اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''اس (قرآن) میں بالتصریح کہیں نہیں لکھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی، نہ ہی یہ لکھا ہے کہ آپ یوسف کے بیٹے تھے۔'' (شعلہ مستور، ص۱۰۵)

اب جب کہ قرآن سے بالتصریح یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ پیدا ہوئے تھے یا باپ کے ذریعہ تو اس کا لازمی اور منطقی تقاضا یہی قرار پاتا ہے کہ مکمل سکوت اختیار کیا جائے۔ نہ اس بات پر زور دیا جائے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور نہ ہی اس بات پر کہ وہ باپ کے ذریعہ متولد ہوئے۔ علمی دیانت بھی اسی خاموشی کو لازم ٹھہراتی ہے۔ قرآن کریم کے ایک مخلص اور خداترس طالبِ علم کے لیے بھی صرف اور صرف یہی رویہ شایانِ شان ہے۔ نیز تقویٰ و پرہیزگاری کے علاوہ حکمت و مصلحت کے لحاظ سے بھی عافیت اسی طرزِ عمل میں ہے۔ لیکن ہمارے 'مفکر قرآن' صاحب نہ تو قرآن کی حدود میں رہنا پسند کرتے ہیں (کہ آزادی، انسان کا 'بنیادی حق' ہے، جس سے محروم ہونا اُنہیں پسند نہیں) اور نہ ہی سکوت و خاموشی اختیار کرنا چاہتے ہیں (کہ ایسا کریں تو ان کی عقلِ عیار بیکار اور ان کا شغلِ قلم کاری تعطل کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں) اس لیے وہ خود کو مجبور پاتے ہیں کہ قرآنی 'اَغلال و اِصر' سے آزاد ہوکر دنیائے مغرب کے اسلام دشمن 'محققین' (مثل رینان وغیرہ) کی اتباع میں ابن مریمؑ کو 'ابن یوسف' بنا ڈالیں اور پھر اپنی بے معنی نکتہ آفرینیوں دوراز کار موشگافیوں اور خسیس و رکیک تاویلات کے ذریعہ اپنی ہر لمحہ بدلنے والی عقلِ عیار کی خاطر قرآنِ کریم کے محکم اور اٹل حقائق کو توڑا مروڑا جائے۔

پھر حرام ہے جو کبھی 'مفکر قرآن' صاحب یہ سوچیں کہ قرآنی حقائق کی شکست و ریخت کے نتیجہ میں معارف القرآن جلد سوم میں اس بحث پر جو کچھ لکھ چکے ہیں، اس کے ساتھ قدم قدم پر تضادات و تناقضات کا کس قدر وسیع و عریض خارزار پیدا ہو رہا ہے۔ بس اب ان کے قلب و ذہن پر ایک ہی دُھن سوار ہے کہ واقعہ ولادتِ مسیح علیہ السلام سے معجزانہ پہلو کو زائل کردیا جائے، خواہ اس کے لیے ترجمہ آیت اور مفہوم قرآن میں مسخ و تحریف سے کام لینا پڑے یا قواعدِ زبان کو پس پشت ڈالنا پڑے یا بین القوسین اضافی الفاظ کے ذریعہ مدلولاتِ آیات کا حلیہ بگاڑنا پڑے، ان کی بلا سے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

قرآن بمقابلہ مغربیت اور روّیۂ پرویز

یہاں 'مفکر قرآن' صاحب کے 'قرآنی ذوق' اور 'علمی مزاج' کا یہ پہلو بھی قارئین کرام سے مخفی نہیں رہنا چاہیے کہ قرآنی تصریحات اور مغربی تحقیقات میں جب تعارض واقع ہوجاتا ہے تو ان کے نزدیک قرآنی تصریحات کی بجائے مغربی تحقیقات ہی شرفِ تقدم کا مستحق قرار پاتی ہیں۔ اس کے لیے ان کی دلیل یہ ہوا کرتی ہے کہ ''ہمارے ہاں تو جمود ہی جمود اور تقلید ہی تقلید ہے، تحقیق و ریسرچ کا کام تو ہے ہی نہیں، یہ تو صرف مغرب ہی میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا تحقیقاتِ مغرب کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔'' اس سے قارئین کرام یہ نہ سمجھیں کہ پرویز صاحب تقلید سے بے زار اور گریزاں تھے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا، وہ بڑے پختہ مقلد تھے اور انتہائی جامد اور اندھی تقلید میں مبتلا تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ تقلیدِ کہن کی بجائے، تقلیدِ نو پر قائم تھے۔ وہ تقلیدِ قدیم پر خوب برسا کرتے تھے مگر تقلیدِ جدید کا التزام کیا کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد حنبلؒ کی تقلید کی سخت مخالفت (بلکہ مذمت) کیا کرتے تھے۔ لیکن 'امام' کارل مارکس، 'امام' ماؤزے تنگ، 'امام' چارلس ڈارون اور 'امام' رینان کی تقلیدِ جامد پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اور وہ بھی اس حد تک کہ اگر کہیں قرآن اور ائمہ مغرب کے موقف میں غیر فیصلہ کن صورتحال (TIE) پڑ جاتی تو وہ مغرب ہی کے اماموں کی پیروی کو ترجیح دیتے ہوئے قرآن کو چھیل چھال کر کتاب اللہ کو مطابق مغرب بنانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ قرآنی تصریحات کو وہ اپنی اُس 'عقل عیار' کی کسوٹی پر پرکھا کرتے تھے جو مغربیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور جسے وہ اپنی 'قرآنی بصیرت' کا نام دیا کرتے تھے۔

ان ساتوں مثالوں سے یہ واضح ہے کہ 'مفکر قرآن' صاحب اگرچہ نام قرآن ہی کا لیا کرتے تھے لیکن ہدایت وضلالت کا اصل معیار اُن کے ہاں تحقیقاتِ مغرب ہی تھیں۔ وہ صحت وسقم کی جانچ پرکھ کے لیے اپنے دل و دماغ میں رچے بسے نظریات کو قرآنِ مجید کی کسوٹی پر پرکھنے کی بجائے اکتشافاتِ مغرب ہی کی کسوٹی پر پرکھا کرتے تھے۔ اپنے قلبی معتقدات کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن پر حاوی رکھتے ہوئے ترازو، باٹ اور تولی جانے والی ہر شئے کو غلط ملط کر ڈالنے کے عادی تھے۔ قرآن، قرآن کی رَٹ لگاتے ہوئے بھی وہ اپنے قلبی آرا و افکار، ذہنی نظریات و معتقدات اور دماغی خیالات وتصورات کو اَصل قرار دے کر قرآنِ کریم کو ان کے مطابق ڈھالا کرتے تھے، نہ کہ ان (تخیلات ومزعومات) کو قرآن کے مطابق۔ پھر ایسا کرتے ہوئے وہ ان لوگوں کی روش اپنایا کرتے تھے جو تاویل وتفسیر کے نام پر تحریف وترمیم قرآن پر کمربستہ رہے ہیں اور یہی رویہ ہمیشہ ہی سے ضالین اور بے توفیق لوگوں کا روّیہ رہا ہے، لیکن بڑی ڈھٹائی اور بلند آہنگی سے وہ الٹا اعلان یہ کیا کرتے تھے:

''ہمارے سامنے، ہدایت اور ضلالت کا معیار قرآنِ مجید ہے۔ اگر ہمیں اپنی ہدایت وضلالت کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے لیے ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ اپنے دماغ میں جو اعتقادات ہوں، اُنہیں قرآنِ مجید کی کسوٹی پر پرکھیں اور ایسا کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس بات کا التزام رکھیں کہ اپنے دماغ کے کسی عقیدہ کو قرآن پر اثر انداز نہ ہونے دیں، ورنہ ترازو، باٹ اور جس چیز کو تولا جا رہا ہے۔ سب خلط ملط ہو جائیں گے اور ہم فیصلہ نہیں کر سکیں گے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو تمام مذاہب، آرا و افکار، عقائد و خیالات کے بارے میں اصل ماننا چاہئے نہ یہ کہ ہم مذاہب وعقائد کو اصل مان کر پھر ان پر قرآنِ مجید کو پرکھیں اور پھر قرآن مجید میں تاویل وتحریف کریں جیسا کہ ضآلین اور بے توفیق لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔'' (طلوعِ اسلام: جنوری ۱۹۵۹ء ص ۳۱)

'مفکر قرآن' کا اس 'وعظ دل پذیر' کے ساتھ عمل کیا ہے، وہ مذکورہ بالا ساتوں مثالوں سے بخوبی عیاں ہے۔

قارئین سے معذرت کے ساتھ: محدث کے چند شمارے دو ماہ کے مشترک شماروں کے طور پر شائع ہو رہے ہیں اور ان کی ضخامت معمول سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ فوری طور پر ہر ماہ اشاعت کا سلسلہ بحال کیا جائے۔ تازہ شمارہ کی غیر معمولی تاخیر کی ہنگامی وجہ یہ رہی کہ رمضان المبارک کے مہینے میں محدث کا کمپیوٹر کسی ناعاقبت اندیش نے چوری کر لیا جس سے بہت سے مضامین ضائع ہو گئے، ان مضامین کو دوبارہ تیار کرنے سے حالیہ شمارہ میں مزید تاخیر ہو گئی۔ شمارہ نمبر کا ریکارڈ رکھنے والے حضرات محدث کے سلسلہ نمبر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال شمارہ نمبر ۳۳۱ جولائی اور اگست ۲۰۰۹ء کا مشترکہ شمارہ تھا، جبکہ حالیہ شمارہ نمبر ۳۳۲ ستمبر، اکتوبر کا مشترکہ شمارہ ہے، اور اگلا شمارہ نمبر ۳۳۳ نومبر اور دسمبر ۲۰۰۹ء کا مشترکہ شمارہ ہوگا۔ مزید تفصیل کے لئے محدث کے مینجر صاحب کے موبائل نمبر پر آپ رابطہ کر سکتے ہیں۔ محمد اصغر 0305-4600861

© rasailojaraid.com